ہدیۂ عقیدت

خلوص اور احترام کے ساتھ

محترم مظہر امام

کی

خدمت میں

عابد مناوری

سری نگر ۱۶ اپریل ۸۴ء

love, Prosperity and

Kind fortune light

Your way.

God will be ever

with you.

Not just be for ever.

Rose

Prosperity

Your Kind fortune

بَرَجستَہ

برجستہ

عابد مناوری

جے۔ کے۔ بک ہاؤس۔ ویر مارگ۔ جموں (توی)

فن	: شاعری	صنف	: غزل
فن کار	: عابد مناوری	انتخاب	: ڈی۔ ڈی۔ کھوسلہ
کتابت	: ماجد خاں رامپوری	تزئین	: فضیلت
پہلی بار	: ایک ہزار	اشاعت	: ۱۹۸۴ء
مطبع	: امرو تیبرا آفسیٹ پریس	قیمت	: ۳۵/ روپے

ناشر

جے کے بک ہاؤس۔ ویر مارگ۔ جموّں (توی)

اظہارِ تشکّر

اس شعری مجموعہ کی اشاعت کے سلسلے میں جموّں و کشمیر کی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے جزوی مالی مدد کے لئے مصنّف ممنون ہے۔
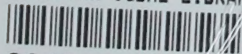
استاذی پدم شری ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی مرحوم
کے نام

یہ خبر کس قدر ہے بارِ گوش
آج ہم میں نہیں جنابِ جوش
وہ جو "فردوسِ گوش" تھی کل تک
آج عنقا ہے وہ "نوائے سروش"
بزمِ مے خانہ سخن ہے اداس
اب نہ چھلکے گا "بادۂ سرجوش"
ہائے وہ باشعور دیوانہ
ہائے وہ خالقِ "جنون و ہوش"

کس سے کسبِ ضیائے شعر کریں
ہوگئی شمعِ علم و فن خاموش

جموں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء

حکیم منظور کی نذر

میرے آنگن میں بھی اے قوسِ قزح! اک دن اُتر
زندگی میں تیرا اِک اِک رنگ بھرنا ہے مجھے

سنہ ۱۹۷۱ء سے سنہ ۱۹۸۲ء تک

ایک ہی لفظ میں دفتر لکھنا
خط اُسے سوچ سمجھ کر لکھنا

جب چلی تیز ہوا کی تلوار
کتنے پنچھی ہوئے بے پر لکھنا

چاندنی کس کا مقدر ٹھہری
کس کا تاریک رہا گھر لکھنا

نام بھی اُس کا جو لکھنا پڑ جائے
روشِ عام سے ہٹ کر لکھنا

جھیل سے اُبھری تھی جب قوسِ قزح
وہ سُلگتا ہوا منظر لکھنا

خوف کرنا نہ ہوا کا ہرگز
ریگِ صحرا پہ سمندر لکھنا

ہے عجب کربِ قلم اے عابدؔ!
جو نہ لکھنا ہو وہ اکثر لکھنا

کیوں نہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ اِتراتی ہوا
چاند جیسے اِک بدن کو چھُو کر آئی تھی ہوا

یُوں خیال آتا ہے اُس کا یاد آئے جس طرح
گرمیوں کی دوپہر میں شام کی ٹھنڈی ہوا

اور ابھی سُلگیں گے ہم کمرے کے آتشدان میں
اور ابھی کہسار سے اُترے گی برفیلی ہوا

ہم بھی اِک جھونکے سے لُطف اندوز ہو لیتے کبھی
بُھولے بھٹکے اس گلی میں بھی چلی آتی ہوا

ایک زہریلا دُھواں چاروں طرف بکھرا گئی
سب کو اندھا کر گئی ایسی چلی اندھی ہوا

اُس نے لکھ بھیجا ہے یہ پیپل کے پتّے پر مجھے
کیا تجھے راس آگئی بجلی کے پنکھے کی ہوا

کیوں کر اے عابد! بجھا پاتا میں اپنی تِشنگی
[illegible]

میرے آنگن سے کبھی ہو کے نہ گزرا سورج
راستہ اپنا کسی دن تو بدلتا سورج

دن جو نکلا بھی تو چھاتے رہے غم کے بادل
دِل کی نگری پہ کبھی کھُل کے نہ چمکا سورج

قہقہہ زن ہے مری ہار پہ دشمن میرا
پردۂ شب سے پھر اک بار نکل آ سورج

اک طرف رات کے شیدا مہ و انجم کتنے
اک طرف دن کا پرستار اکیلا سورج

غیر ممکن ہے شبِ غم کی سحر اے عابد!
کس نے مغرب سے نکلتے ہوئے دیکھا سورج

کیا کہوں میں کس امتحان میں تھا
قید خود اپنے ہی مکان میں تھا

پر سمیٹے تو یہ ہوا محسوس
اور ہی کچھ مزا اُڑان میں تھا

ہم الگ ہو کے بھی الگ نہ ہوئے
ٹوٹتا رشتہ درمیان میں تھا

جس کا مذکور ہی نہیں تھا کہیں
میں وہ کردار داستان میں تھا

آفتاب اپنی اَنا کا ہوں میں
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوں میں

بُوند مانگی تو سمندر پایا
پھر بھی حیرت ہے کہ پیاسا ہوں میں

غمِ امروز میں اُلجھا ہوں ابھی
بے نیازِ غمِ فردا ہوں میں

ناز کرتا ہُوں میں خود پر ایسے
جیسے تیرا ہی سراپا ہوں میں

خود سے ہو جاتا ہوں کچھ اور بھی دُور
اپنے نزدیک جب آتا ہُوں میں

پہلے خود آگ لگا دی گھر کو
خود ہی اب محوِ تماشا ہوں میں

آج بھی ٹوٹ کے بادل برسا
آج بھی صورتِ صحرا ہوں میں

جانتا ہوں میں حقیقت اپنی
تیرا ادنیٰ سا کرشمہ ہوں میں

گھیر لیتی ہیں مجھے دیواریں
شب گئے گھر جو پلٹتا ہوں میں

حرف ناگفتہ تھا جب زندہ تھا
اب مگر ایک صحیفہ ہوں میں

کوئی تو ہے مرے اندر عابدؔ!
ورنہ کیوں خود سے بھی ڈرتا ہوں میں

پُر اُمید اور نہ مایوس ہی ہونے دے گا
نہ ہنسنے دے گا مجھے پل بھر نہ وہ رونے دے گا

بخش دے گا وہ مجھے سات سُمندر لیکن
ایک قطرے سے لبوں کو نہ بھگونے دے گا

دن میں سُورج کی شعاعوں سے بدن جُھلسیں گے
رات کو چاند بھی تخ بستہ بچھونے دے گا

آنے دے گا نہ کبھی مجھ کو وہ ساحل کی طرف
نہ ہی گرداب میں کشتی کو ڈبونے دے گا

خواب زاروں ہی میں بھٹکائے گا ڈر تا بہ سحر
جاگنے دے گا مجھے اور نہ سونے دے گا!

زہر پینے کے لئے جب کوئی تیار نہیں
پھر وہ کس آس پہ ساگر کو بلونے دے گا

سب کو مصرُوف وہ رکھّے گا جہاں میں عابد
خود کو لیکن کبھی دُنیا میں نہ کھونے دے گا

یُوں دُور سے نہ تیشۂ آذر دکھا مجھے
مجھ کو تراش کر مرا پیکر دکھا مجھے

ایثارِ عشق سے ابھی نا آشنا ہے تُو
اک روز میرے سانچے میں ڈھل کر دکھا مجھے

مانا کہ میرے پاس نہیں کچھ سوائے دل
تو کوئی شے جو دل سے ہو بہتر دکھا مجھے

کتنا بدل چُکا ہوں میں اتنا تو جان لُوں
پھر آج میرا رُوپ تُو بھر کر دکھا مجھے

عآبدؔ یہ کیا ہُوا ہے کہ اپنے ہی گھر میں آج
اِک اِک سے کہہ رہا ہوں مرا گھر دکھا مجھے

سرسبز کھیتوں کبھی پیپل کی چھاؤں میں
ہم گاؤں میں تھے جیسے ہوں پنچھی فضاؤں میں

دہلیز پر چراغ جلاتے ہو کس لئے !
بھکشو پلٹ کے جا بھی چکے ہیں گپھاؤں میں

جنگل سے لے تو آئے ہو پودا گلاب کا
مُرجھا نہ جائے شہر کی باسی ہواؤں میں

دل آئینہ تھے چہروں پہ چہرے کہیں نہ تھے
لوگوں نے تن چُھپائے نہ تھے جب عباؤں میں

پیاسوں کا اپنے دھیان ہی شاید نہیں اُسے
گنگا کو جو چُھپائے ہوئے ہے جٹاؤں میں

ہم غش تھے برشگال پہ لیکن خبر نہ تھی
پوشیدہ بجلیاں بھی ہیں کالی گھٹاؤں میں

خواہش، طلب، اُمید، ہوس، جُستجو، للک
عابدؔ گھرا ہُوا ہُوں کئی داشتاؤں میں

دُھوپ جب بکھری تو کچھ اور ہی منظر نکلا
میں جسے دشت سمجھتا تھا سمندر نکلا

آنے والا ہے وہ اس شہر میں سب کو تھی خبر
ایک بھی شخص مگر گھر سے نہ باہر نکلا

ناپ کر مجھ کو سبھی آج پریشان ہوئے
آسماں بھی نہ مرے قد کے برابر نکلا

اپنی ناکامیِ تدبیر پہ آذر ہے اُداس
جس کسی کو بھی چھُوا ریت کا پتھّر نکلا

کتنا گنجان بہ ظاہر نظر آتا تھا مجھے
اک بیابان مگر شہر کے اندر نکلا

کیا ہی تعظیم سے پیش آئے ہیں دُنیا والے
میں جب آج ایک نیا چہرہ لگا کر نکلا

جس کے سر تھا ہر اک الزام روایت کوشی
اِک نئے دَور کا عابد وہ پیمبر نکلا

نگر نگر دلِ مُضطر لیے پھرا مجھ کو!
مجھے تلاش تھی جس کی نہ مل سکا مجھ کو

میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا
ہوا کا ایک ہی جھونکا بجھا گیا مجھ کو

جتن کرو مجھے واپس زمیں پہ لانے کا
نہ ایسا ہو کہ نگل جائے یہ خلاء مجھ کو

میں اُس کے بارے میں کچھ اُس سے پوچھتا لیکن
مِلا وہ جب کبھی بکھرا ہُوا مِلا مجھ کو!

یہ سچ ہے اِس میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں
تباہ کر گئی ہے خود مری اَنا مجھ کو ! !

میں اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا صدیوں سے
کہاں کہاں وہ مگر ڈھونڈتا رہا مجھ کو

مری وفا کا اُسے بھی ہے کس قدر احساس
وہ کتنے دُکھ سے یہ کہتا ہے "بھول جا مجھ کو"

کٹی ہے کرب و بلا میں تمام عُمر مری
حیات لگتی ہے میدانِ کربلا مجھ کو

میں ایک راز تھا دُنیا کے واسطے عابدؔ
اُس اِک نظر نے مگر فاش کر دیا مجھ کو

پانیوں پر نقش، خوشبوؤں کے پیکر دیکھنا
آنکھ مانگے ہے فقط اَن دیکھے منظر دیکھنا

کس جزیرے پر نظر آئے گی ہریالی مجھے!
اور ابھی قسمت میں ہیں کتنے سمندر دیکھنا

ایک رستہ اَن گنت رستوں کا بن جائے گا جال
اِس طلسمی دشت میں پیچھے نہ مُڑ کر دیکھنا

کچھ پُرانے جھونپڑے ساحل پہ باقی ہیں ابھی
شاید ان میں کوئی مِل جائے شناور دیکھنا

کوئی آ کر جھونک دیتا ہے مری آنکھوں میں دُھول
چاہتا ہُوں خود کو جب اپنے برابر دیکھنا

ریزہ ریزہ ہو کے گلیوں میں بکھر جاؤ گے تم
ایک دن میری طرح گھر سے نکل کر دیکھنا

کر دیا تقسیم اسے بھی سرحدوں کی ضرب نے
کیوں کر اب ممکن ہوا اے عابد! "مناورؔ" دیکھنا

آندھی چلی کچھ ایسی بکھرنا پڑا مجھے
جینے کی آرزو تھی کہ مرنا پڑا مجھے

دل میں تھی روشنی کے جزیروں کی آرزو
اندھے سمندروں میں اُترنا پڑا مجھے

اِک دن کسی نے دیکھا تھا کھڑکی سے جھانک کر
پھر اُس گلی سے روز گزرنا پڑا مجھے!

ناقابلِ معاف سہی جرمِ سرکشی
مجبور تھا گناہ یہ کرنا پڑا مجھے!

روکا ہوا تھا گردشِ دوراں نے راستہ
کچھ دیر مے کدے میں ٹھہرنا پڑا مجھے

جائے پناہ مِل نہ سکی آسمان پر
واپس اسی زمیں پہ اُترنا پڑا مجھے!

دھوکے کچھ ایسے کھائے ہیں سایوں کے شہر میں
عابدؔ خود اپنے آپ سے ڈرنا پڑا مجھے

وفا کے مرحلے کتنے کڑے ہیں
ہم اپنے آپ سے اکثر لڑے ہیں

یہ کیسے شہر میں آج آ گئے ہم
یہاں بونوں کے قد کتنے بڑے ہیں

عجب وہ ایک جھونکا تھا ہوا کا
تناور پیڑ بھی اوندھے پڑے ہیں

مِلن کی پیاس بجھ پائے تو کیوں کر
ابھی راتیں ہیں چھوٹی دن بڑے ہیں

ملی ہے یہ سزا سچ بولنے کی
زباں پر ان گنت چھالے پڑے ہیں

جنھیں اُس پار اُترنے کی لگن ہے
انھیں کے ہاتھ میں کچے گھڑے ہیں

جہاں کل تک تھا آسیبوں کا مسکن
اُسی پیپل پر اب جھولے پڑے ہیں

ابھی انسانیت زندہ ہے عابدؔ
ابھی اِس شہر میں کچھ جھونپڑے ہیں

خوُن میں لَت پَت سُمندر دیکھنا تھا
ڈوبتے سوُرج کا منظر دیکھنا تھا

میں اِسی دن کے لئے زندہ تھا شاید
خود کو اپنے گھر میں بے گھر دیکھنا تھا

ہم زمیں والے یہاں کِس حال میں ہیں
آسمانوں سے اُتر کر دیکھنا تھا

بے سبب گرمی نہ تھی میرے لہُو میں
جوہرِ تیغِ سِتم گر دیکھنا تھا

دُھول اُن آنکھوں ہی میں جھونکی گئی تھی
جن کو وہ بے سایہ پیکر دیکھنا تھا

شہر میں کتنے ہی دروازے کھُلے تھے!
اِک نہیں تو دوسرا گھر دیکھنا تھا

اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر اِک دن
برف پر عابدؔ پھِسل کر دیکھنا تھا

پھولوں کی دل نواز پھبن کو ترس گئے
اہلِ چمن بہارِ چمن کو ترس گئے

جب سے ہمارے شہر میں سورج مقیم ہے
ہم روشنی کی ایک کرن کو ترس گئے

جس کی سیاہ آنکھوں سے اُجلی ہے کائنات
اہلِ دل اُس غزالِ ختن کو ترس گئے

سرشار اگرچہ بادۂ نو سے ہیں پھر بھی ہم
سرمستیٔ شرابِ کہن کو ترس گئے

عابدؔ چھپا ہوا ہے کہاں اِن دنوں کہ ہم
اُس تاجدارِ مُلکِ سخن کو ترس گئے

یہ جانتا ہوں وفا کرے گا جہان کیسی
سجائے بیٹھا ہوں پھر بھی دل کی دوکان کیسی

یہ بات الگ ہے کہ اب پلٹ کر نہ آسکیں گے
مگر تھی اِس بار پنچھیوں کی اُڑان کیسی

کئی برس سے ہم ایک آنگن میں رہ رہے تھے
یہ آج دیوار آگئی درمیان کیسی!

زمین سے تو فرار ہو کر میں آگیا ہوں
مجھے سزا دے نہ جانے اب آسمان کیسی

نہ سوچ میرے بدن پہ آتے ہیں زخم کتنے
یہ دیکھ مسمار کی ہے میں نے چٹان کیسی

نہ واقعہ تھا نہ کوئی کردار اِس طرح کا
مجھے سُنائی گئی مگر داستان کیسی

سفر کی عابدؔ ابھی تو میں سوچ ہی رہا تھا
سما گئی انگ انگ میں یہ تکان کیسی

ان گنت صدیوں سے تنہا نظر آتا ہے مجھے
چاند بھی میرے ہی جیسا نظر آتا ہے مجھے

بے یقینی کے حصاروں میں مُقیّد ہوں میں
اب تو دن میں بھی اندھیرا نظر آتا ہے مجھے

وہ جو اک کچّا مکاں شہر میں باقی ہے ابھی
اِن عمارات سے اُونچا نظر آتا ہے مجھے

اِتنا آسان نہیں خود سے گزُرنا یارو
یہ تو ایک آگ کا دریا نظر آتا ہے مجھے

تِشنگی میری بُجھائے گا یہ کیا اے عابدؔ
خود سُمندر ابھی پیاسا نظر آتا ہے مجھے

سرتا بہ پا وہ نور کا پیکر بھی آئے گا
اُجیالی ساعتوں کا پیمبر بھی آئے گا

کاغذ کی کشتیاں ہی سہی ساتھ لے چلو
رستے میں اک اتھاہ سمندر بھی آئے گا

بے وجہ تو نہیں در و دیوار منتظر
پردیس جو گیا ہے پلٹ کر بھی آئے گا

شعلوں کو شوق سے تُو ہواؤں کے پنکھ دے
پھیلی جب آگ زد میں ترا گھر بھی آئے گا

اِک بار دوستوں پہ ذرا اعتبار کر
پھر دیکھ تیری پیٹھ پہ خنجر بھی آئے گا

دروازے، کھڑکیاں سبھی چاہے تُو بند رکھ
باہر اگر ہے شور تو اندر بھی آئے گا !

عابدؔ سیاہ رات کا ہو گا کبھی تو انت
پیشِ نگاہ صبح کا منظر بھی آئے گا

عجب شور ہر سُو ہے پھیلا ہُوا
سُنا اَن سُنا ایک جیسا ہُوا

یہ سب جان کر بھی کہ پیاسا ہوں میں
کبھی آپ کا دل نہ دریا ہُوا

حقیقت مری ایک نقطہ سہی
اِک اِک سمت لیکن ہوں پھیلا ہُوا

خطا کون سی مجھ سے سرزد ہُوئی
مرا شہر میں کیسے شُہرا ہُوا

مرے ہونٹ تو آپ نے سی دیے
اگر میری چُپ کا بھی چرچا ہُوا ؟

پرندہ بھی کوئی ہوا میں نہیں
چلو گھر چلیں اب اندھیرا ہُوا

سرِ عام کچھ کہنے والا تھا وہ
خدا جانے عابدؔ کہ پھر کیا ہُوا

کیا نئے کیا ان گنت صدیوں پرانے راستے
یاس کا کُہرہ ہے اور اندھے ہیں سارے راستے

ایک دن بے نام ہو جائیں گی سب پگڈنڈیاں
پھیل جائیں گے یہاں بھی لمبے چوڑے راستے

کھیت بنجر، پیڑ ننگے، سب کنوئیں بے آب ہیں
جب سے پکّے ہو گئے گاؤں کے کچّے راستے

کب تک آخر ہم سفر رہتے ہمارے ہم سفر
مختلف سمتوں میں جب بکھرے ہوئے تھے راستے

گُم رہی کا بے جہت صحرا ہے تا حدِ نظر
کر دیے ہیں بے نشاں تُند آندھیوں نے راستے

کچھ عجب لذّت عذابِ آبلہ پائی میں ہے
ورنہ ہم کیوں منتخب کرتے کٹیلے راستے

جس طرف جی چاہے اے عابدؔ! ترا چل اُس طرف
ایک ہی منزل پہ جا ملتے ہیں سارے راستے

چمن میں اُڑتی پھرتی تیتلیوں کو کون پُوچھے گا
جو تم آجاؤ تو ان گل رُخوں کو کون پُوچھے گا

یہاں کے لوگ اپنے آپ سے بھی جب نہیں واقف
پرائے شہر میں پردیسیوں کو کون پُوچھے گا !

سُمندر پھیل کر آ پہنچا ہے بنجر پہاڑوں تک
اب اے تالاب ! تیری مچھلیوں کو کون پُوچھے گا

عجب یکسانیت کی دُھند کا پردہ ہے آنکھوں پر
یہاں ہر پل بدلتے منظروں کو کون پُوچھے گا

ہمیں اِک رہ گئے ہیں آخری آذر یہاں عابد
ہمارے بعد بے جاں پتّھروں کو کون پُوچھے گا

لشکر فصیلِ شہر تک آکر پلٹ گیا
بے جنگ کیسے آج سکندر پلٹ گیا

موتی وہ کیوں بکھیرتا اندھوں کے سامنے
دریا سے خالی ہاتھ شناور پلٹ گیا

شاید مرے لہُو کے نمک میں کشش نہ تھی
سینے تک آکر آج بھی خنجر پلٹ گیا

دِل کی گلی بھی بھول بُھلیّوں سے کم نہ تھی
حیران ہیں سبھی کہ میں کیوں کر پلٹ گیا

دریا کے بدلے سامنے تھا ایک ریگ زار
سُورج غروب ہوتے ہی منظر پلٹ گیا

غرقاب کرتا آیا تھا کتنی ہی بستیاں!
صحرا کو دیکھتے ہی سُمندر پلٹ گیا

اِس بے حسوں کے شہر میں عابدؔ وفا نہ ڈُھونڈ
مجھ تک وہ آیا اور یہ کہہ کر پلٹ گیا

آپ اپنے سے جو بچھڑوں تو یہ منظر دیکھوں
ورنہ مشکل ہے کہ خود کو ترے در پر دیکھوں

شاید آجائے مرے ہاتھ بھی کوئی موتی
کیوں نہ اِک روز سمندر میں اُتر کر دیکھوں

صرف اِس جُرم پہ رکھا گیا پیاسا مجھ کو
میں نے چاہا تھا کہ ہر ہاتھ میں ساغر دیکھوں

گردشِ شام و سحر ہی کو نہ دوں ہر الزام
گھومتی ہے یہ زمیں جس پہ وہ محور دیکھوں

مُنتظر ہوں میں اب اُس وقت کا جب اے عابدؔ
ہر طرف اپنے سمندر ہی سمندر دیکھوں

سورج طلوع ہونے کا منظر بھی دیکھ لے
اِک روز خواب گاہ سے باہر بھی دیکھ لے

کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے ہیں صلیب پر
ہیں آزمائشوں میں پیمبر بھی دیکھ لے

دشتِ بلا میں گھوم بگولوں کے ساتھ ساتھ
چلتا ہے کیسے وقت کا چکر بھی دیکھ لے

مانا کہ تشنگی تری صحرا کی دین ہے!
فیاض کس قدر ہے سمندر بھی دیکھ لے

کھاتے ہیں زخم پیٹھ پہ اپنوں کے درمیاں
اب دستِ غیر میں ہے جو خنجر بھی دیکھ لے

سچ بات کہنے کے لئے اپنی زبان کھول
پھر کس طرف سے آتے ہیں پتھر بھی دیکھ لے

سر پر بَلا کی دُھوپ رہی ہے تمام دن
اب سَردِ شب کی اوڑھ کے چادر بھی دیکھ لے

دُنیا کو تو نے دیکھا ہے کھڑکی میں بیٹھ کر
اِک روز اپنے گھر سے نکل کر بھی دیکھ لے

برجستہ شعر کہنے میں عابد ہے منفرد
ہے ایسا کوئی اور سخنور بھی دیکھ لے

میں اُس کے سامنے ہوں پھر بھی ڈھونڈتا ہے مجھے
عجیب شخص ہے مجھ سے چھپا رہا ہے مجھے

بغیر اس کے نہیں کیا مری کوئی پہچان!
تو میرے نام ہی سے کیوں پکارتا ہے مجھے

اگر یہ سچ ہے تو پھر کس طرح میں زندہ ہوں
زمانہ کہتا ہے اُس نے بھلا دیا ہے مجھے

میں اُس کے قد کے برابر ہوں کب یہ میں نے کہا
یہ آسمان عبث کیوں ستا رہا ہے مجھے

تمام شب کیا کسبِ ضیا مجھی سے مگر
سحر کے آتے ہی اُس نے بجھا دیا ہے مجھے

قریب سے وہ گزرتا ہے بے نیازانہ
جب آگے بڑھتا ہے مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہے مجھے

رُکا تھا راہ میں پل بھر اِس ایک لغزش نے
ہمیشہ کے لئے پتھر بنا دیا ہے مجھے !!

میں گھر سے نکلا ہی تھا اپنی جستجو میں ابھی
وہ بن کر آئینہ مجھ سے ملا گیا ہے مجھے

ضرور مجھ میں کوئی خاص بات ہے عابدؔ
جو شخص ملتا ہے مجھ سے وہ سوچتا ہے مجھے !

مجھ سے میرا سایہ تک بھی چھین کر لے جائے گا
رات جب آئے گی سورج بھی دغا دے جائے گا

زندگی بھر وہ سمندر میں رہے گا غوطہ زن
پھر بھی اپنے ساتھ کربِ تشنگی لے جائے گا

کس کو یہ معلوم تھا پیش آئے گا وہ اس طرح
مسکراہٹ چھین لے گا اشکِ غم دے جائے گا

کھو گیا پُر نور خوابوں کی دمک میں وہ اگر
صبح کا خوش رنگ منظر دیکھنے سے جائے گا

غرقِ گردابِ بلا کر دے کہ ساحل بخش دے
کیا خبر طوفاں مری کشتی کہاں لے جائے گا

خود گلستاں میں وہ لوٹے گا بہاروں کے مزے
کاغذی پھولوں کا گلدستہ مجھے دے جائے گا

اک اسی اُمید پر عابدؔ ہوں سرگرمِ سفر
شوقِ منزل ہی سرِ منزل مجھے لے جائے گا

فرصت ملی دُنیا سے تو ہم بات کریں گے
خود سے بھی کسی روز مُلاقات کریں گے

کب آئے گا وقت، ایسے بھی جب چھائیں گے بادل
صحراؤں پہ جو پھولوں کی برسات کریں گے

ہم مہر بہ لب ہو چکے لیکن ابھی مُنصف
کچھ اور بھی تجویزِ مکافات کریں گے

عابدؔ سفرِ دشت سے آئے ہیں پلٹ کر
ہم پیش اُسے کون سی سوغات کریں گے

ان گنت ان دیکھے رستوں سے گزرنا ہے مجھے
جب کہیں جاکر سمندر میں اترنا ہے مجھے

میرے آنگن میں بھی اے قوسِ قزح! اک دن اتر
زندگی بس تیرا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے

دیکھتا ہوں کیوں گھنے پیڑوں کے سایوں کی طرف
جب سرِ منزل پہنچ کر ہی ٹھہرنا ہے مجھے!

آج اک کچے گھڑے پر پھر یہی تحریر ہے
غرقِ دریائے وفا ہو کر ابھرنا ہے مجھے

میرے تلووں میں جو چھالے ہیں وہ بے مصرف نہیں
آخر اس صحرا کو بھی سیراب کرنا ہے مجھے

کب تلک آخر رہوں گا خود میں ہی سمٹا ہوا
اک نہ اک دن تو بہر صورت بکھرنا ہے مجھے

خود کو رکھوں یا نہ رکھوں عابد اس فہرست میں
آج اپنے دشمنوں کا ذکر کرنا ہے مجھے!

اپنے وجدان کے آئینے میں دیکھا جاؤں
کاش ایسا ہو خود سے الگ کر کے بھی سوچا جاؤں

میں ہوں مجبور کہ ہوں جھیل کا قیدی ورنہ
موج در موج اُچھلتا ہوا بہتا جاؤں

نام اُس کا جو کوئی لے تو بھر آئیں آنکھیں
جامِ لبریز کی مانند چھلکتا جاؤں!

بار بار ایسے اُچھالو نہ مجھے سُوئے فلک
کہیں ایسا نہ ہو سُورج سے میں ٹکرا جاؤں

شہر کی بھیڑ میں کھو بیٹھوں نہ میں اپنا وجود
خود کو گھر ہی میں رکھوں باہر اکیلا جاؤں

اِس سے پہلے کہ نگل جائے سمندر مجھ کو
اَبر بن کر کسی صحرا پہ برستا جاؤں!

اپنی قربت کا ہے احساس ابھی اے عابد
اِتنا تنہا بھی نہیں ہوں کہ میں گھبرا جاؤں

کوئی دستک، کوئی ہنگامہ، نہ کوئی قہقہا
شہر میں ہوتے ہُوئے بھی گھر مرا صحرا میں تھا

کس میں ہمت تھی بیاں دیتا جو سُورج کے خلاف
رات کے سر ہی رہا الزام دن کے قتل کا

کُہرہ کچھ ایسا پڑا دونوں ہی پتھر ہو گئے
مجھ میں اور اُس میں تھا ورنہ دو قدم کا فاصلہ

یُوں تو میرے ساتھ اُترے تھے کئی میدان میں
میں اکیلا ہی مگر دُشمن کے لشکر سے لڑا

اُس کی اِک اِک بات تھی تردید کے قابل مگر
جو بھی وہ کہتا رہا چُپ چاپ میں سُنتا رہا

جب نیا آیا تھا میں نے بھی تو سوچا تھا یہی
کس طرح اِس بے مُروّت شہر میں رہ پاؤں گا

کر دیا سب کو اپاہج دوپہر کی دھوپ نے
کس کی اُنگلی تھام کر چلتی یہ بے چاری ہوا

اپنا خالی چہرہ لے کر پھر رہا ہُوں شہر میں
وہ مری پہچان بھی مجھ سے جُدا کر لے گیا

دیکھتا رہتا ہُوں عابد نیند کی پریوں کا رقص
میرے آنگن میں ہُوا کرتا ہے اکثر رت جگا

بھروسا اتنا بھی اچھا نہیں کتابوں پر
کبھی تو کیجیے کچھ اعتبار آنکھوں پر

کسی پہ کون لگائے گا قتل کا اِلزام
ہے ایک دوسرے کا خون سب کے ہاتھوں پر

تھا حرف حرف کبھی جن کا چشمۂ انوار
جمی ہے گرد کی تہہ آج اُن صحیفوں پر

مرے بچاؤ کی خاطر کوئی بھی در نہ کھُلا
اگرچہ آنکھیں تھیں چسپاں سبھی دریچوں پر

ملا جو دھوپ کا اک لمس بے وجود ہوئے
یقین میں نے کیا بھی تو کیسے رنگوں پر !

حقیقتوں کی صلیبوں پر آج لٹکے ہیں
تھا اعتماد بہت جن کو اپنے خوابوں پر

پڑا ہُوا ہے عجب قحط غم گُساروں کا
چھڑک لو آج نمک خود ہی اپنے زخموں پر

ہمارے ہونے کی دی جائے گی سزا یہ ہمیں
نہ لکھا جائے گا کچھ بھی ہمارے کتبوں پر

گھروں سے لوگ نکل کر کہاں گئے عابد
تمام شہر میں ہیں قُفل کیوں مکانوں پر

بخشے گئے ہیں جو تجھے کرب و عذاب لکھ
اپنا فسانہ اے دلِ پُر اضطراب لکھ

تیغِ جفا کو چوم کے کر خود کو سُرخ رُو
اپنے لہو سے اپنی وفا کی کتاب لکھ

مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج پہ غور کر
دن کی شکست اور شفق کا عذاب لکھ

کہہ کر شکست خوردہ مرا حوصلہ نہ توڑ
ناکامیوں میں ہی تو مجھے کامیاب لکھ

وہ شہر کا رئیس ہے کچھ تو ہو امتیاز
سب کو جناب اور اُسے عالی جناب لکھ

کیا جانے کب کہاں سے اُٹھے کوئی سر فروش
ہر سنگِ رہ گزار پہ تو انقلاب لکھ

عابدؔ نہ کہہ سکے گا تو ہر بات رُو بہ رُو
اُس کے اک اک سوال کا خط میں جواب لکھ

جوگیوں کی صورت آوارہ رہے بے گھر رہے
فرق کیا ہم شہر میں یا شہر سے باہر رہے

ہم ہیں پوشیدہ جو پیکر تھا نہ ظاہر ہو سکا
آذروں کے درمیاں رہ کر بھی ہم پتھر رہے

دھوپ اُترتی کس طرح آخر ہمارے صحن میں
وہ بھی تھی کچھ بے مروّت ہم بھی کچھ خودسر رہے

کس قدر تنہا غموں کے محبسِ بے در میں ہیں
دوستوں کا ذکر کیا ہم خود سے بھی کٹ کر رہے

ایک پل بھی سو نہ پایا آج تک میں سکھ کی نیند
دکھ کے انگارے ہی اے عابد! مرا بستر رہے

اپنے لئے خود آپ ہی آزار ہو گئے
ہم دُشمنوں کے ہاتھ کی تلوار ہو گئے

اہلِ خطا کو عہدۂ مُنصف عطا ہوا
جو بے گُناہ تھے وہ گنہگار ہو گئے

حیرت کدہ تھا وہ کہ تری جلوہ گاہ تھی
اہلِ نگاہ نقش بہ دیوار ہو گئے

یُوں ذوقِ جُستجُو کو مرے دے گئے ہوا
کھُل کر کچھ اور بھی وہ پُر اسرار ہو گئے

دل دار، دل نواز، دل آرام تھے جو لوگ
دل سرد، دل خراش، دل آزار ہو گئے

میں نے ہی پھُول بوتے تھے ایک ایک گام پر
میرے لیے ہی راستے پُر خار ہو گئے

کچھ پل کی تیرگی کا یہ عابدؔ اثر ہُوا
سب لوگ ظُلمتوں کے پرستار ہو گئے

کوئی اُمید کا تِنکا نظر نہ آئے مجھے
کہیں یہ اندھا سُمندر نہ نِگل جائے مجھے

دُکھوں کی بھیڑ میں خود سے بچھڑ گیا ہوں میں
ہے کوئی ایسا کہیں سے جو ڈُھونڈ لائے مجھے

میں کون ہُوں؟ مرا مصرف ہے کیا؟ کھُلے مجھ پر
کبھی تو کوئی مرے بارے میں بتائے مجھے!

ہوا کبھی مجھ کو نہ لے جائے جانبِ ساحل
نہ اپنی گود میں گرداب ہی چھُپائے مجھے

میں اِس جنم کا سدا آما ہُوں دربدر عابد
کہاں ہے کرشن مرا جو گلے لگائے مجھے!

میں ایک بے نام سی اذیت میں مبتلا تھا
تھا برف سارا بدن مگر ذہن جل رہا تھا

عجیب موسم تھا سب مناظر دھواں دھواں تھے
سفید کاغذ پہ خامہ بے حس پڑا ہوا تھا

فضا میں ایک چیخ لحظہ لحظہ اُبھر رہی تھی
بیاضِ خاموشی کے میں اوراق اُلٹ رہا تھا

اگر ہوا تیز ہو نہ باہر نکلنا گھر سے
وہ جاتے جاتے مجھے بس اِتنا ہی کہہ گیا تھا

بھٹک رہا تھا اِدھر اُدھر جو چراغ لے کر
اُسی نے سورج کو اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا

چلا گیا ہے وہ مجھ کو بے نام کر کے عابدؔ
جسے میں اپنا ہی نام لے کر پکارتا تھا

شاخوں پہ پرندوں کے چہکنے کی خبر دے
سُورج ہے اگر تُو، مجھے پیغامِ سحر دے

اوروں کو مئے صاف ملے گی جو یہ سچ ہے
جتنی بھی ہے تلچھٹ مرے پیمانے میں بھر دے

اِمکان کی سرحد سے پرے جانا ہے مجھ کو
لمبی ہے مُسافت مجھے اب اذنِ سفر دے

ہو جائے نہ مُنکر کہیں مجھ سے مرا "میں" ہی
اِک روز مجھے بھی مرے ہونے کی خبر دے

میں قوسِ قزح بن کے اُبھر آؤں گا عابدؔ
تو دیکھنے والوں کو فقط حُسنِ نظر دے

جب سے ہاتھ اپنا اُس کے ہات میں ہے
ہر قدم دشتِ حادثات میں ہے

خود بھی شاید اُسے نہیں معلوم
جو سِتم اُس کے اِلتفات میں ہے

سنگ باری تھا مشغلہ جس کا
وہ بھی شامِل جُنوں صفات میں ہے

ڈھونڈیئے بھی تو کس طرح اُس کو
گم جو اپنی تجلّیات میں ہے

ذہن فرسُودہ دائروں کا اسیر
آنکھ تازہ مُشاہدات میں ہے

جس کو دیکھا نہیں کسی نے کہیں
تذکرہ اُس کا شش جہات میں ہے

اپنے گھر میں وہ قید ہے پھر بھی
شامل ایک ایک واردات میں ہے

کھولتا ہے جو آسماں کے بھید
خود وہ گردِ توہُمّات میں ہے

گوشِ دل سے جو سُن رہے ہیں سبھی
بات کچھ تو ہماری بات میں ہے

عقل محوِ نظارہ ہے عآبد!
عشق مصرُوف تجرِبات میں ہے

کربِ بے رنگی کا رنگیں منظروں پر لکھ دیا
تو نے اے صرصر! یہ کیا نازک گلوں پر لکھ دیا

اب کوئی کاگا نہ بولے ان مُنڈیروں پر کہیں
شہر والوں نے مکانوں کی چھتوں پر لکھ دیا

دوپہر کی لُو سے کمرے کو بچانے کے لیے
"صبح کی ٹھنڈی ہوا" سب کھڑکیوں پر لکھ دیا

بُوند بھر پانی کو ہم اہلِ زمیں ترسا کیے
کیا کہیں کیا کس نے اُڑتے بادلوں پر لکھ دیا

اور تو کوئی سند دُنیا نہ دے پائی ہمیں
لفظِ ناکامی ہماری کاوشوں پر لکھ دیا

اپنے ہی چہرے کی جب پہچان مشکل ہو گئی
اُس نے "بے عکس آئینہ" سب آئینوں پر لکھ دیا

زندگی بھر ہم رہے کچھ ایسے سر گرمِ سفر
منزلوں کو راستوں کے پتھروں پر لکھ دیا

ایک انجانے سے رسم الخط میں اے عابدؔ مجھے
اُس نے بوسیدہ پُرانے کاغذوں پر لکھ دیا

دُھند لائے منظروں کی خبر دے گیا مجھے
یہ کون آ کے زخمِ نظر دے گیا مجھے

بے برگ و بار تھے جو شجر دے گیا مجھے
کیا سوچ کر وہ دُھوپ نگر دے گیا مجھے

لوگوں میں بانٹتا رہا جو مُسکراہٹیں
مجھ سے ملا تو دیدۂ تر دے گیا مجھے

ڈالا ہے اُس نے اب کہ عجب امتحان میں
تیز آندھیوں میں ریت کا گھر دے گیا مجھے

بخشی تھی جس کو میں نے جزیروں کی مملکت
وہ کالے پانیوں کے بھنور دے گیا مجھے

دیکھا جب اُس نے کوئی نہیں مجھ سا تیز رو
جو ختم ہو کہیں نہ سفر دے گیا مجھے

عابدؔ وہ خود مقیم ہے پھُولوں کے شہر میں
صحرائے خارزار مگر دے گیا مجھے

ہر قدم پر گھنے پیڑوں کے خنک سائے تھے
ایک پل بھی نہ مگر آبلہ پا ٹھہرے تھے

کوئی دشمن ہی نہ تھا اُس کا جہاں میں شاید
بے فصیل اُس نے کئی شہر بسا رکھے تھے

سرد مہر اتنی کہاں دھوپ ہُوا کرتی تھی
برف صورت کبھی پتھر تو نہیں پگھلے تھے

بے خبر تھی وہ کسی گھر میں نہ مہماں ہو گا
منتظر پھر بھی اُسی کے سبھی دروازے تھے

کچھ زیادہ ہی سخن فہم تھے وہ اے عابدؔ!
میری فریاد کو بھی نغمہ کہا کرتے تھے

شفا کی آس رہی بھی تو کن مسیحوں سے
جو آشنا ہی نہیں تھے ہمارے زخموں سے

کہیں یہ آج کا دن ہی نہ روزِ محشر ہو
نکل پڑے ہیں سبھی لوگ اپنی قبروں سے

خود اپنے آپ سے ملنے کی جب نہیں فرصت
عبث نہ وقتِ ملاقات مانگ لوگوں سے

نہ پوچھو ان سے حقیقت کا رنگ کیسا ہے
جواب پاؤ گے کیا خواب آنکھوں سے

ملے گا اور تمھیں کیا سوائے مایوسی
اُجالے مانگتے ہو کیوں سیاہ راتوں سے

حصارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
تری تلاش میں دُنیا ہے کتنی صدیوں سے

مُخنک ہواؤں میں بھی کس بلا کی حِدّت ہے
یہ راز پُوچھ سُلگتے ہوئے چناروں سے

گزُر نہیں کسی آسیب کا یہاں عابد
ڈرے ہوئے ہیں سبھی لوگ اپنے سایوں سے

بادل برس کے دشت کی کایا پلٹ گیا
صدیوں کا جو غبار تھا پل بھر میں چھٹ گیا

اے موجۂ ہوا! تجھے کیا آ گیا خیال
تو کیوں مری کتاب کے اوراق اُلٹ گیا

تقلیدِ کوہ کن پہ مجھے یہ سزا ملی
خود اپنے تیشے ہی سے مرا ہاتھ کٹ گیا

آندھی چلی کچھ ایسی بلا خیز شہر میں
ایک ایک چہرہ گردِ اذیت سے اَٹ گیا

طوفاں سے لڑتے لڑتے بہت تھک گیا وہ جب
ساحل سمجھ کے موجِ بلا سے لپٹ گیا

عابدؔ لغت پہ جمتی گئیں گرد کی تہیں
ہر لفظ اپنے رشتۂ معنی سے کٹ گیا

کتنا بے حس ہوں کہ اتنا بھی پتہ چلتا نہیں
میرے اندر کا خلا پُر ہو چکا ہے یا نہیں

پھر گلی میں قہقہے اُبھرے ہیں ہر دن کی طرح!
آج حیراں ہوں کہ میں کھڑکی سے کیوں جھانکا نہیں

از رہِ تفریح اپنے گھر سے نکلا ہے مگر
یہ ہے بازارِ اذیت اُس کو اندازا نہیں

میرے چہرے سے نہ جانے اُس نے کیا کچھ پڑھ لیا
ایک لمحہ بھی مرے کمرے میں وہ ٹھہرا نہیں

کس قدر مجبور ہیں بے بس ہیں ہم اِس دَور میں
عابد اپنے آپ پر بھی اختیار اپنا نہیں

دُشمنوں میں گھِرا ہُوا ہوں میں
کتنا محفوظ ہو گیا ہوں میں

کون سے حرف میں چھُپا ہوں میں
اپنی آواز ڈھونڈتا ہوں میں!!

کوئی تو ہے وہ جس کی خاطر آج
آپ اپنے سے لڑ پڑا ہوں میں

میں ہوں انمول یہ خبر ہے مجھے
پھر بھی بے مول بِک رہا ہوں میں

یا تو الفاظ بے معانی ہیں
یا کوئی دُور کی صدا ہوں میں

جاذبیت نہ کوئی لطف و سُرور
کیسے جینے پہ مر رہا ہوں میں

کیوں نہ تعبیر سے رہوں محروم
دن میں بھی خواب دیکھتا ہوں میں

اُن سے کچھ اس طرح مخاطب ہوں
جیسے اشعار کہہ رہا ہوں میں

عہدِ نو کے لُغت میں اے عابدؔ!
لفظِ اخلاص ڈھونڈتا ہوں میں

کسے پینے پلانے کی للک تھی
ہماری دوڑ ہی مے خانے تک تھی

کوئی تو تھا حریفِ ظلمتِ شب
وہ چاہے ایک جگنو کی چمک تھی

اگر چاہا نہ تھا اُس گل بدن کو
مری سانسوں میں پھر کس کی مہک تھی

ہم آپس میں مزاجاً مختلف تھے
یہی اک بات تھی جو مشترک تھی

کسی کے قہقہے کا تھا وہ سرگم
کہ چاندی کے کٹورے کی کھنک تھی

ذرا بے برگ پیڑوں سے یہ پوچھو
ہوا پہلے بھی کیا اتنی خنک تھی

مری تاریک راتوں میں بھی عابد
کئی پُرنور خوابوں کی دمک تھی

آج بھی کل کی طرح آنگن غبار آلود تھا
خود بھی حیراں تھا میں گھر پر کس طرح موجود تھا

جانے اپنی کون سی خوبی کھٹکتی تھی مجھے!!
آپ ہی حاسد تھا میں اور آپ ہی محسود تھا

میں نے پہچانا نہیں تھا جب تک اپنے آپ کو
حلقۂ احباب میرا کتنا لامحدود تھا

کب تک آخر خود کو رکھ سکتا میں سرگرمِ سفر
سامنے میرے فقط میدانِ ہست و بود تھا

غم نہ ہوتا نقدِ جاں بھی میں لٹا دیتا اگر
دل کی بازی میں تو لے عابدؔ! زیاں بھی سود تھا

یہ کس نے بخش دیا کربِ انتظار مجھے
بھری بہار میں ہے حسرتِ بہار مجھے

مرے سخن کا مقدر تھی معنیوں کی دھوپ
کہیں مِلا نہ کوئی لفظ سایہ دار مجھے

میں اب تو سات سمندر کا کر چکا ہوں سفر
کسی جزیرۂ سرسبز پر اُتار مجھے!

کبھی یہ دیکھ کہ ہے مجھ میں حوصلہ کتنا
کبھی تو اپنے حریفوں میں کر شمار مجھے

نِگل چکا ہوں میں خود ہی تمام قوسِ قزح
تباہ کر گیا رنگوں کا کاروبار مجھے

میں اپنے آپ سے بے اعتنا نہ ہو جاؤں
نہ دیکھ ایسے پلٹ کر تو بار بار مجھے

فرار کی کوئی صورت ہی اب نہیں عابد
ملی ہوئی ہے عجب قیدِ بے حصار مجھے

اے اہلِ گلستاں! کبھی وہ بھی زمانہ تھا
ایک ایک شاخِ گل پہ مرا آشیانہ تھا

جس سے خنک ہوا کی توقع رہی ہمیں
اُس بوڑھے پیڑ پر کوئی پتّہ ہرا نہ تھا

پڑھ کر سُنا رہا تھا وہ کیا کیا حکائتیں
ساری کتاب کوری تھی کچھ بھی لکھا نہ تھا

میرے وجود کا تھا یہ پُر درد سانحہ!
اپنے ہی گھر میں مجھ سے کوئی آشنا نہ تھا

عابدؔ تمام شہر میں پہچان تھی مری!
جب تک میں اپنے آپ کو پہچانتا نہ تھا

چاروں طرف فضا میں ہے بکھرا ہُوا دھواں
اِس چمنیوں کے شہر میں تازہ ہوا کہاں

تم آج پہلی بار میاں آتے ہو یہاں
صحراؤں میں تو روز ہی چلتی ہیں آندھیاں

محفوظ رہ سکوں گا میں آخر تو کس طرح
پیروں تلے زمیں ہے نہ سر پر ہی آسماں

بیتے دنوں کی یاد بھی ان میں مکیں نہیں
سُونی پڑی ہُوئی ہیں دِلوں کی حویلیاں

آتِش فشاں پہاڑ ہیں کس کو تھی یہ خبر
ہم تو خُنک ہوا کے لیے آتے تھے یہاں

جتنے بھی تھے جہاز وہ غرقاب ہو گئے
عابدؔ پلٹ کر آ گئیں کاغذ کی کشتیاں

مہر و مہ کتنی بار گہنائے
پھر بھی اہلِ زمیں نہ شرمائے

خالی خالی سے لگ رہے ہیں ہم
کچھ کہیں جیسے آج بھول آئے

ایسا موسم کبھی نہ دیکھا تھا
شاخ سرسبز پھول زردائے

بے صدا شور میں تھے ہم غلطاں
اپنی آواز بھی نہ سُن پائے

کیا ہے اوقات زرد پتّوں کی
کون عابدؔ ہوا کو سمجھائے

کہا جو راحت یک لمحہ بخش دے مجھ کو
تمام رنج و الم اُس نے دے دیئے مجھ کو

ہوا تھمے گی کبھی اِس کا انتظار نہ کر
بکھر رہا ہوں میں آ کر سمیٹ لے مجھ کو

جنوں کہے نہیں صحرا کی وسعتوں کا جواب
ہجومِ شہر مگر راستہ نہ دے مجھ کو

سجانے چاہے تھے میں نے تو خود پہ ساتوں رنگ
مگر یہ رنگ ہی بے رنگ کر گئے مجھ کو

جنم جنم سے مجھے انتظار ہے جس کا
وہ ہے بھی یا نہیں کچھ تو پتہ چلے مجھ کو

کٹھن نہ تھا مرا مِلنا مگر تھی شرط اتنی
بجھا کر آنکھوں کو اپنی وہ ڈھونڈتے مجھ کو

چھپا ہُوا تھا میں زیرِ زمیں مگر عابدؔ
خلا کے دشت میں وہ ڈھونڈتے رہے مجھ کو

ابرِ باراں میں جھلستا ساون
کبھی دیکھا نہ تھا ایسا ساون

ساتھ لے آتا ہے یادیں کتنی
کبھی آتا نہیں تنہا ساون

کوئی کمرے سے نہ باہر نکلا
صحن میں کس کو بھگوتا ساون

کوئی جھولا نہ پڑا پیپل پر
اب کے بے رنگ ہی گزرا ساون

کھِل گئی قوسِ قزح اے عابدؔ
آگیا رنگ برنگا ساون

اتنے رُخ اپنے دیکھ کے حیران ہوں بہت
آئینہ توڑ کر میں پریشان ہوں بہت

صحرا ہے دل مرا یہ کوئی جانتا نہیں
سب کی نظر میں شہر ہوں گنجان ہوں بہت

کرتا رہا ہوا کا تعاقب تمام عمر!
یہ سچ ہے دوستو! کہ میں نادان ہوں بہت

مجھ سے ملا رہا ہے مجھے کوئی اِس طرح
جیسے میں اپنے آپ سے انجان ہوں بہت

ظُلمت اُگل رہا تھا یہ سورج بہ جائے نُور
کتنا عجیب خواب تھا حیران ہوں بہت

کچھ اور بڑھ گیا مرا احساسِ تشنگی!
چھُو کر سمندر آج پشیمان ہوں بہت

عابدؔ ہے مثلِ شہرِ خموشاں مِرا وجود
آباد اتنا ہو کے بھی ویران ہوں بہت

بھا گئی یوں البیلی دُھوپ
صحراؤں نے لے لی دُھوپ

اَبر چھٹا تو مجھ کو لگی!
دُلہن نئی نویلی دُھوپ

قدم قدم پر پیڑ ہی پیڑ
پھر بھی ہم نے جھیلی دُھوپ

جب بھی اِس پر غور کیا
بن گئی ایک پہیلی دُھوپ

قوسِ قزح کے رنگ بنے
بکھری جب البیلی دُھوپ

پربت، میداں، گُلشن، دشت
عابدؔ سب کی سہیلی دُھوپ

حُسنِ اخلاص اِک بھرم نکلا
پردۂ لُطف میں سِتم نکلا

ہوگئیں اور اُونچی دیواریں
گھر سے باہر نہ پھر قدم نکلا

کیا کہیں دِل شکستگی کا راز
خود پہ اپنا ہی یہ کرم نکلا

سینکڑوں کوس کا سفر تھا مگر
فاصلہ اک قدم سے کم نکلا

وہ بھی کچھ مجھ سے دُور دُور رہے
اِن دنوں میں بھی گھر سے کم نکلا

گُونگے الفاظ کیا بتائیں گے
کس طرح معنیوں کا دم نکلا!

ہم تو کچھ اور ہی سمجھتے تھے!
عابد اِک صاحبِ قلم نکلا

ہمدردیوں کو چھوڑ کے بے درد ہو گئے
ایسی ہوا چلی سبھی دل سرد ہو گئے

بیٹھے سبھاتے لوگوں نے منزل کو جا لیا
جو تیز گام تھے وہ سفر گرد ہو گئے

سینہ سپر تھے جو اُنھیں بزدل کہا گیا
زخمی تھی جن کی پیٹھ وہ پامرد ہو گئے

عابدؔ کب آئے آپ چناروں کی چھاؤں میں
پتے اِک ایک پیڑ کے جب زرد ہو گئے

وہ کیسا خواب تھا پچھلے پہر جو دیکھا تھا
خود اپنے آپ ہی سے میں لپٹ کے رویا تھا

سبھی سے پُوچھ رہا ہے اب اپنے بارے میں
اک ایک شخص کو جو آئینہ دکھاتا تھا

پلٹ کر آیا ہُوں رُخ پر سیاہ رات لیے
میں آفتاب کی مانند گھر سے نکلا تھا

ہوئی تھی جس سے مُلاقات کچھ برس پہلے
وہ کوئی اور تھا لیکن ترے ہی جیسا تھا

سُمندروں کے سفر میں کئی کو ملبس تھے
میرا وُجود ہی اک بے شجر جزیرا تھا

اکیلا میں ہی نہ تھا جستجُو میں سرگرداں
اک ایک ہاتھ میں اندھی گلی کا نقشا تھا

کسی نے ہاتھ ہی اُس کے چُرا لیے عابد
وہ آج ورنہ مجھے قتل کرنے والا تھا

کیا غلط ہے کیا بجا ہے یہ کبھی سوچا نہ کر
سُکھ سے رہنا ہے تو اپنے آپ سے اُلجھا نہ کر

پیروی گوتم کی کرنا اِس قدر آساں نہیں
زندگی کو چشمِ عبرت سے کبھی دیکھا نہ کر

خود کو کھو بیٹھے گا اک دن ہم نہ کہتے تھے تجھے
شب گئے اُس پیڑ کے نیچے سے تو گزرا نہ کر

اپنی ہی نظروں سے تو خود بھی نہ گر جائے کہیں
اِس قدر نزدیک سے ہر شخص کو دیکھا نہ کر

رہ گیا ہے اک یہی لے دے کے تیرا آئینہ
دِل کو اے عابدؔ غموں کی دھول سے میلا نہ کر

یہ شبِ تار یہ گھنا جنگل
راستے سب نگل گیا جنگل

دشت در دشت دوڑتی سڑکیں
شہر در شہر پھیلتا جنگل

کتنی صدیوں میں لہلہایا تھا
ایک دن میں اُجڑ گیا جنگل

جب کوئی صاحبِ جنوں ہی نہیں
راہ پھر کِس کی دیکھتا جنگل

سُن رہا تھا مری دُہائی مگر
کیسا گُم سُم پڑا رہا جنگل!

دُھوپ کے شہر ہی میں لوگ رہے
پاس ہی تھا ہرا بھرا جنگل

مجھ کو بھٹکا رہا ہے اے عآبد!
اِس غزل کی ردیف کا جنگل

سامنے میرے نہ دیکھے گا مجھے!
ہو گا جب تنہا وہ سوچے گا مجھے

مجھ کو میرے رُو برُو کر دے گی رات
دن مگر مجھ سے چُھپا لے گا مجھے!

اتنی لاپروا ہی بھی اچھی نہیں
ایسے اک دن تُو گنوا دے گا مجھے

دُھوپ آنگن سے اُترنے کی ہے دیر
پھر وہ روکے گا نہ ٹوکے گا مجھے!

اِک خلش عابدؔ رہے گی عُمر بھر
سانحہ دل کا نہ بھُولے گا مجھے!

جن کے چہرے بجھے بجھے ہوں گے
سوزِ ہجراں میں جل رہے ہوں گے

ایسے ویران تو نہیں تھے کھنڈر
چند چڑیوں کے گھونسلے ہوں گے

جن چراغوں سے اُٹھ رہا ہے دھُواں
آندھیوں سے وہی لڑے ہوں گے

جستجو میں ہوں جن کی سرگرداں
کیا مجھے وہ بھی ڈھونڈتے ہوں گے

تیری تصویر دیکھنے والے!!
خود بھی تصویر ہو گئے ہوں گے

خواب یا بےخودی کے عالم میں
خود سے ہم بارہا ملے ہوں گے

ایسے گستاخ تو نہ تھے عابدؔ
کچھ زیادہ ہی پی گئے ہوں گے

جہاں کہیں بھی گیا وہ مری نظر میں تھا
میں اپنے گھر میں ہی بیٹھے ہوئے سفر میں تھا

نہ اُبھرا ذائقہ میرا کسی زباں پہ کبھی
وہ میں ہی تھا جو نہاں شاخِ بے ثمر میں تھا

وہ ایک بات جو کھُل کر زباں پر آ نہ سکی
اُس ایک بات ہی کا ذکر شہر بھر میں تھا

مرے ہی خون سے سینچا گیا تھا نخلستان
مرے لیے ہی نہ سایہ کسی شجر میں تھا

بھٹک رہا تھا عبث در بہ در میں اے عابدؔ
مجھے خبر ہی نہ تھی وہ مرے ہی گھر میں تھا

یہ مانا ایک ننھا سا دیا ہوں
مگر ظلمات کا دشمن رہا ہوں

کہاں جاؤں گا خود سے بھاگ کر میں
اُمیدوں کے حصاروں میں گھرا ہوں

کوئی سمجھے تو کیوں کر مجھ کو سمجھے
کبھی نُقطہ کبھی میں دائرا ہوں

بھٹکتا ہے تُو اپنی جُستجو میں
میں اپنا آپ تجھ میں ڈھونڈتا ہوں

خود اپنے چہرے سے واقف نہیں میں
زمانے کے لئے گو آئینا ہوں

بتا کیا اس سے بڑھ کر اور کرتا
تری خاطر میں خود سے بھی لڑا ہوں

یہ کوئی شہر ہے عابد کہ جنگل
بھرے بازار میں لُوٹا گیا ہوں

دُور تک رہ گزر ہے تابندہ
گمرہی کا سفر ہے تابندہ

تیرگی میں تمام شہر ہے غرق
اک دریچہ مگر ہے تابندہ

اہلِ فن ہو گئے ہیں گوشہ نشیں
ہُنرِ بے ہُنر ہے تابندہ

قافلے کا کہیں نشاں ہی نہیں
صرف گردِ سفر ہے تابندہ

برق جب سے گری ہے اے عابدؔ
ایک میرا ہی گھر ہے تابندہ

دشتِ تنہائی کا آسیب ڈراتا ہے مجھے!
اِس خرابے میں کہاں چھوڑ کے جاتا ہے مجھے!

صُورتِ موم ہے لے دوست ابھی میرا وجود
میں پگھل جاؤں گا کیوں آنچ دکھاتا ہے مجھے

رات آتی ہے تو کرتی ہے مری دل جوئی
دن جب آتا ہے تو دن بھر ہی رُلاتا ہے مجھے

ثبت صدیوں سے ہیں جس پر مرے قدموں کے نقوش
رہ نُما آج وہی راہ دکھاتا ہے مجھے

کل جسے میں نے دکھائی تھی رہِ میخانہ
آج وہ پینے کے آداب سکھاتا ہے مجھے

وہ عجب ڈھنگ سے کرتا ہے پریشاں مجھ کو
اک نیا رُوپ مرا روز دکھاتا ہے مجھے

ایک چہرہ بھی شناسا نہ مِلا اے عابدؔ
یہ بھرا شہر بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے

صحرائے خامشی کا نہ مجھ کو سراب دے
میرے سوال کا مجھے کچھ تو جواب دے

کب سے اسیرِ گردشِ لیل و نہار ہوں
جو میرے بس میں ہو مجھے وہ آفتاب دے

ہر سُو توہمات کی چھائی ہوئی ہے گرد
اہلِ زمیں کو پھر کوئی تازہ کتاب دے

سورج، ستارے چاند دیے آسمان کو
مجھ دشت کو بھی تو کوئی خودرو گلاب دے

ظلمت میں کام آئیں گے عابدؔ یہی چراغ
آنکھوں میں تو سجا کوئی جتنے بھی خواب دے

گزرتے بادلوں سے التجائیں کر رہا تھا
کھلی چھت پر وہ بارش میں نہانا چاہتا تھا

اُسے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ مجھ سے کہہ چکا تھا
مگر میں ان کہی باتوں ہی میں کھویا ہُوا تھا

نظر آسودگی مجھ کو میسّر ہی کہاں تھی
مرے حصّے میں وہ دُھندلے مناظر لکھ گیا تھا

پھر اس کے بعد صحرا کا سفر درپیش تھا جب
شجر کے سائے میں پل بھر میں آخر کیوں رُکا تھا

کفن باندھے ہُوئے سر سے سبھی میدان میں تھے
کوئی جج کُنڈل پہن کر گھر میں وہ بیٹھا ہُوا تھا

حرارت بخشتا کیا میرے تخ بستہ بدن کو
مرے آنگن تک آتے آتے سورج بجھ گیا تھا

کبھی ریتیلے پتھّر کی طرح دانستہ عابدؔ!
کسی اُونچی پہاڑی سے لُڑھک کر دیکھنا تھا

میں اپنے سینے میں خنجر اُتار کر دیکھوں
وہ شخص ہی لے مجھے شاید پُکار کر دیکھوں

گروں میں برف کی مانند جلتے سُورج پر
زمیں کا کرب وہاں بھی اُتار کر دیکھوں

کسی طرح تو مری رُوح کی گھُٹن کم ہو
لباسِ جسم ہی اپنا اُتار کر دیکھوں

کتابیں ریڈیو اخبار گھر کے ہنگامے
کب اپنے ساتھ میں کچھ پل گزار کر دیکھوں

وہ آسماں پہ ہے نہ کہیں بحر و بر میں ہے
پھر بھی اک آرزو لیے کوئی سفر میں ہے

پیشِ نگاہ گرد ہے ناممکنات کی
اک آس ہے کہ پھر بھی دلِ معتبر میں ہے

برسوں ہوئے اِدھر سے وہ گزرے تھے ایک بار
ہل چل سی ایک آج بھی دل کے نگر میں ہے

جس کے بیان کے لیے اِک عمر چاہیئے
وہ داستان اُس نگہِ مختصر میں ہے

پُر لطف زندگی ہے تو دُنیا ہے پُرکشش
جب سے کسی کا حسنِ مجسم نظر میں ہے

عابدؔ رہِ خلوص پہ ہوں پھر بھی گامزن
ایک اِک قدم پہ گو خطر اِس رہ گزر میں ہے

تیرے بارے میں سوچتے رہنا
کتنا دلچسپ ہے غزل کہنا

صحنِ گلشن میں سارا سارا دن
تتلیوں کے ہجوم میں رہنا

شام آتے تو گھر کے آنگن میں
آپ خود سے پہیلیاں کہنا

جھلملاتے ہوئے ستاروں میں
تیرا ہی عکس ڈھونڈتے رہنا

صرف دیکھا ہے چاند نے عابد
میری آنکھوں سے اشکِ غم بہنا

آنے والا نہیں ہے جب کوئی
منتظر کیوں ہے بے سبب کوئی

کیوں عبث اُلجھنوں میں اُلجھا ہوں
جب نہیں خواہش و طلب کوئی

یہ الگ بات ہے کہ یاد نہیں
دل کے بجھنے کا تھا سبب کوئی

ہو گئے محبسوں کے عادی لوگ
وا نہ ہو گا دریچہ اب کوئی

ہو نہ جائے یہ کائنات اُداس
مطربہ! نغمۂ طرب کوئی

آئی تھی جب صدائے کُن فیکوں
وہ بھی تھا لمحۂ عجب کوئی!

کس طرح پھر مناؤں اے عابدؔ
رُوٹھ جائے جو بے سبب کوئی

اپنی ہی بات لگتی ہے خود بھی گراں مجھے
ہر دن بدلنا پڑتا ہے اپنا بیاں مجھے

تاریکیوں میں ڈوب گیا ہوں میں بے طرح
یہ کون مل گیا ہے سرِ کہکشاں مجھے

ناموسِ عشق پر کبھی آنے دیا نہ حرف
گو روز بیلنا پڑا کوہِ گراں مجھے

میں ہی حصارِ ذات سے باہر نہ آسکا
ڈھونڈا کیے تھی وسعتِ کون و مکاں مجھے

عابد اُڑان کے لیے تولے جب اپنے پر
بوجھل لگا ہے پیرہنِ جسم و جاں مجھے

یہ کیسا آئینہ ہے کیا دکھائی دیتا ہوں
میں اونچے قد کا ہوں بونا دکھائی دیتا ہوں

نہ جانے مجھ سے ہے کتنے ہی پیکروں کا وجود
مگر میں خود کوئی سایا دکھائی دیتا ہوں

کرو گے اب نظر انداز کس طرح مجھ کو
زمیں پہ عرش پہ ہر جا دکھائی دیتا ہوں

کبھی ہے ساغرِ زہراب میرے ہاتھوں میں
کبھی صلیب پہ لٹکا دکھائی دیتا ہوں

نگل چکا ہوں میں جب سے تمام بحر و بر
ہوا کے دوش پہ اڑتا دکھائی دیتا ہوں

جمی ہے گرد سبھی آئینوں پر اے عابد!
نہ جانے ان دنوں کیسا دکھائی دیتا ہوں

اپنے ہونے کا تجھے احساس اگر ہو جائے گا
مُعتبر نظروں میں تو نا معتبر ہو جائے گا

چند پل میں منتشر ہو جائے گی قوسِ قزح
منظرِ بے رنگ پھر زخمِ نظر ہو جائے گا

روک لو گے اپنی آنکھوں میں اگر سیلابِ اشک
دیکھ لینا شہرِ دل زیر و زبر ہو جائے گا

بے جہت صحرا میں اے عابدؔ نہ ہاتھ آئے گا کچھ
رفتہ رفتہ خود بھی تو گردِ سفر ہو جائے گا

ایک ایک شے کو شب کا اندھیرا نگل گیا
سُورج تھا ہوشیار کہ بچ کر نکل گیا

پتھر سمجھ رہے تھے سبھی آج تک جسے
مَیں نے چھُوا تو موم کی صُورت پگھل گیا

ہر لحظہ تشنگی مری بڑھتی چلی گئی!
مَیں قطرہ قطرہ کر کے سمُندر نگل گیا

پنچھی تھے زیرِ آب تو پیڑوں پہ مچھلیاں
یہ منظرِ عجب مری آنکھوں کو چھل گیا

اہلِ نظر نے مجھ کو کہا "آذرِ سُخن"!!
پیکر کسی کا جب مرے شعروں میں ڈھل گیا

عابدؔ اسے کہا تھا کہ صحرا پہ کر کرم!
دریا اُمڈ کے شہر ہی سارا نگل گیا

ملا ہوں پہلے پہل پھر بھی ایسا لگتا ہے
جنم جنم سے وہ جیسے مرا شناسا ہے

رچی ہوئی ہیں ہواؤں میں کیسی خوشبوئیں
یقیناً آج پلٹ کر وہ آنے والا ہے

اک ایک پیٹ پہ چپیاں ہیں گھورتی آنکھیں
اک ایک دستِ طلب میں شکستہ کاسہ ہے

ہے انگ انگ میں اُس کے عجیب سی تھرکن
سنبھالنے پہ بھی وہ جسم کب سنبھلتا ہے

یہ سچ ہے میں بھی اذیت پسند ہوں عابدؔ
اُسے بھی مجھ کو ستانے میں لطف آتا ہے

جانے کیسی فضا تھی باہر کی!
گھر کے اندر بلا کی آندھی تھی

اک تو صحرا کا تھا طویل سفر
دھوپ بھی آج قہر کی برسی

کیسا پتھرا گیا ہے ہر چہرہ
کتنے حسّاس ہو گئے ہیں سبھی

آسماں آسماں اُگے سورج
میرے آنگن میں تیرگی ہی رہی

کئی صدیوں سے تھا جو سیلِ تپاں
منجمد آج ہو گیا وہ بھی!!

تیرے چہرے کا عکس ہوتا ہے
چاند میں روشنی نہیں ہوتی

ہر تمنّا جھلس گئی عابدؔ
سوزِ دل تھا کہ آگ جنگل کی

آپ خود اپنے لیے ایک اجنبی سا ہو گیا
تجھ سے مل کر میں بھری دُنیا میں تنہا ہو گیا

رات بھر ایسی مسلسل ریت کی بارش ہُوئی
صبح تک سارے کا سارا شہر صحرا ہو گیا

شومیٔ قسمت نے میری تشنہ ہی رکھا مجھے
میں نے دریا کو چھُوا تو وہ بھی قطرا ہو گیا

کس قدر پُرسوز تھی وہ ایک آہِ کربناک
دوپہر کی دُھوپ کا بھی رنگ کالا ہو گیا

دوستوں سے وہ مُلاقاتیں وہ باتیں اب کہاں
خود کو بھی دیکھے ہُوئے عابدؔ زمانا ہو گیا

خود سے بھی بے نیاز ہو جائیں
آؤ اک دوسرے میں کھو جائیں

کیوں نہ ہم کشتِ نا اُمیدی میں
آرزوؤں کے بیج بو جائیں!!

کب تک اختر شماریاں آخر
ڈھل چلی رات اب تو سو جائیں

تیری یادوں کے شبنمی جھونکے
اکثر آنکھیں مری بھگو جائیں

دن کی بے کیفیاں بُھلا دیں ہم
شب کی سرمستیوں میں کھو جائیں

کہیں گرداب شرمسار نہ ہو
ناؤ ساحل پہ ہی ڈبو جائیں

عابدؔ اُن کو تلاش کرتے ہوئے
ہم بھی اِس بھیڑ میں نہ کھو جائیں

قدم قدم پر طلسمی آہو لبھا رہا تھا
کسی کو ہرنے کا جال پھیلایا جا رہا تھا

عجیب سی کشمکش میں دونوں ہی مبتلا تھے
کسی کو میں تو مجھے کوئی آزما رہا تھا

سبھی کو معلوم تھا یہی فتح پر ہے شاداں
وہ قہقہوں میں شکست اپنی چھپا رہا تھا

کسی سے ملنے کی مجھ کو فرصت ہی کب ملی تھی
وہاں میں خود اپنے آپ کو ڈھونڈتا رہا تھا

اگرچہ اندھی ہواؤں کا تھا وہ دور عابد
چراغ سے میں چراغ پھر بھی جلا رہا تھا

میں بے خبر تھا آج تک اپنے وجُود سے
پھر ایک بار غیب سے آواز دے مجھے

پیاسی زمیں کی اور بھی کچھ پیاس بڑھ گئی
برسے بغیر آج بھی بادل گزر گئے!

ہر روز پڑھتے ہو مرے چہرے کے خدوخال
اِک روز کاش! تُم مرے دِل میں بھی جھانکتے

جب ذِکر چھڑ گیا مرے حالِ تباہ کا
کچھ دوست جان بُوجھ کر انجان بن گئے

معنی کی جُستجُو میں ہے عاجز اک ایک لفظ
آداب جب سے بدلے ہیں گفت و شنید کے

دیکھا تو کیجئے کبھی دروازہ کھول کر!
دستک یہ کون دیتا ہے روزانہ شب گئے

عابدؔ گئے ہیں جس قدر اُن کے قریب ہم
بڑھتے گئے ہیں اور بھی آپس میں فاصلے

ہے وہ تپش کہ قہرِ خُدا ہے زمین پر
سُورج پگھل کے پھیل گیا ہے زمین پر

کس راستے سے بھاگ کر آخر یہ جائے گا
اِنساں سُمندروں میں گھرا ہے زمین پر

تھے اک خُدا کے سامنے جنّت میں سجدہ ریز
اب تو اک ایک شخص خدا ہے زمین پر

عنقا ہوائے مہرِ محبّت ہے آج کل
چاروں طرف خلا ہی خلا ہے زمین پر

عابد ہُوا ہے اور بھی تنہا ہر آدمی
جتنا ہجُوم بڑھتا گیا ہے زمین پر

دُور سے دیکھنے والو مجھ کو!
کبھی پاس اپنے بُلالو مجھ کو!

کوئی جھونکا نہ اُڑا لے جائے
یوں ہوا میں نہ اُچھالو مجھ کو

پھر نہ بھٹکیں گی تمہاری نظریں
اپنی آنکھوں میں بسالو مجھ کو

میں ہوں گوندھی ہوئی گیلی مٹّی
جو بھی جی چاہے بنالو مجھ کو

گردشِ وقت مری تاک میں ہے
مے کدے سے نہ نکالو مجھ کو!

شاخ سے توڑ ہی ڈالا ہے اگر
اپنے بالوں میں سجالو مجھ کو!

پی چُکا ہوں میں بہت اے عابدؔ
گرنے والا ہوں سنبھالو مجھ کو

گناہ و بے گُناہی ایک سے ہیں
عجب مُنصف انوکھے فیصلے ہیں

فقیروں کو نہ جانے کیا ہُوا ہے
بیاباں میں صدائیں دے رہے ہیں

یہ کس نے لکھ دیا پایاب اِن پر
سمندر اور گہرے ہو گئے ہیں

ترا ذکر آ گیا ہے اِتفاقاً
ہمیں شکوے سب اپنے آپ سے ہیں

یقین اُس پر بھی اب آتا نہیں ہے
جو اپنی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں

کبھی سرسوں جہاں پھُولی ہُوئی تھی
اُنھیں کھیتوں میں اب تھوہر اُگے ہیں

سبھی اشجار ہیں بے برگ عابد
پرندے بے طرح سہمے ہوئے ہیں

رُودادِ قیسؔ ہو کہ مری داستانِ عشق
دُنیا کے لَب پہ کوئی تو افسانہ چاہیئے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک

دل کا قصہ کبھی دُنیا کا فسانہ لکھوں
آخر ان ٹوٹے ہوئے حرفوں سے کیا کیا لکھوں

بھیگی آنکھوں میں ٹھہرتی نہیں تحریر کوئی
اپنے ہونٹوں پہ ہی اب حرفِ تمنّا لکھوں

میں سمندر ہوں مگر خود کو جو لکھنا پڑ جائے
دُھوپ میں ایک جُھلستا ہوا صحرا لکھوں

لکھنے بیٹھا تھا تو کیا کچھ نہ تھا لکھنے کے لئے
اور اب سوچ رہا ہوں کہ تجھے کیا لکھوں

مرے دُکھ سُکھ سے نہیں کوئی بھی واقف عابدؔ
اِس بھرے گھر میں نہ کیوں خود کو اکیلا لکھوں

دِل میں بے چینی نہ تھی سر میں کوئی سودا نہ تھا
یہ ہے قصہ اُن دنوں کا جب تجھے دیکھا نہ تھا

ایک پل میں تم بُھلا دو گے کئی برسوں کا پیار
یُوں بھی ہو سکتا ہے یہ میں نے کبھی سوچا نہ تھا

آئینے میں خود کو جب دیکھا تو حیرانی ہُوئی
آج پہلے کی طرح ہنستا ہوا چہرا نہ تھا

بے تکلف جس کو کہہ سکتا میں اپنا غم گُسار
کوئی میرے حلقۂ احباب میں ایسا نہ تھا

زندگانی سے بہ صد اخلاص پیش آتے رہے
ہم سے گو اس بے مُروّت کا سلوک اچھا نہ تھا

آج تُو نے مجھ سے کر ڈالے ہیں کتنے ہی سوال
تیرے میرے درمیاں تو ایک بھی پردا نہ تھا

آرزُوؤں کے وہ ہنگامے وہ لُطفِ انتظار
اُن دنوں کا ذکر ہے جب شہرِ دل اُجڑا نہ تھا

چوٹ کچھ دل پر لگی ہے آج اے عابدؔ ضرور
ورنہ یوں محزُوں تجھے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

پیغام کس کے آنے کا پُروائیوں میں تھا!
اِک انتظار صبح کی انگڑائیوں میں تھا

وہ سطحِ آب پر ہی مجھے ڈھونڈتے رہے
میں بحرِ بے حدود کی گہرائیوں میں تھا

بے اعتنائیوں کے وہ کیسے تھے سِلسلے
میں آپ خود بھی اپنے تماشائیوں میں تھا

صرصر کا نام لکھا تھا ہر شاخ و برگ پر
مصروف پھر بھی میں چمن آرائیوں میں تھا

یخ بستہ ہاتھ اُس کا چھوُا تو کھلا یہ راز
بے گانہ پن کیوں اُس کی شناسائیوں میں تھا

مانا کہ سب اُسی کے تمنائیوں میں تھے!
میرے سوا تھا کون جو شیدائیوں میں تھا

بازارِ شہر میں بھی ہوُں عابدؔ اُداس اُداس!
خوُش تھا جب اپنی ذات کی تنہائیوں میں تھا

اے دِل ساری دُنیا جھوٹی، سارے دُنیا والے جھوٹے
بس اک پیار کا بندھن سچّا، باقی رشتے ناتے جھوٹے

دوارے دوارے الکھ جگاتا، نگری نگری پھرا ہے جوگی
سچ کی بھکشا کہیں نہ پائی، برسوں بوجھ اُٹھائے جھوٹے

رات نے چاند کو گود لیا جب، آس بندھی کچھ ہمیں بھی لیکن
صُبح کا تارا جاتے جاتے، کر گیا سارے سپنے جھوٹے

اِس جھوٹے سنسار کا بابا، اب تو اک اک کام ہے جھوٹا
بادل بھی برسائے جھوٹے، سُورج بھی چمکائے جھوٹے

شہر اور اہلِ شہر کے چہرے، باہر سے کچھ اندر سے کچھ
دشت بھی دشت نہ رہتا عابدؔ، اس میں جو در آتے جھوٹے

ہر دوست کو آزما رہا ہوں
دانستہ فریب کھا رہا ہوں

جادہ نہ کوئی نشانِ منزل
بے سمت قدم بڑھا رہا ہوں

کیا یُوں پلٹ آئے گا وہ بچپن
کیوں ریت کے گھر بنا رہا ہوں

وہ، اور نگاہِ لُطف مجھ پر
کس وہم میں مُبتلا رہا ہوں

آنکھوں میں نہیں ہے آج بھی نیند
کل رات بھی جاگتا رہا ہوں

منزل کے قریب ہوُں میں شاید
ہر گام پہ لڑکھڑا رہا ہوں!

میں ہوُں اک ذرّہ پھر بھی عابدؔ
سُورج سے نظر ملا رہا ہوں

جوشِ جنون و ہمتِ مردانہ چاہیئے
اُس شمع رُو کو صورتِ پروانہ چاہیئے

رُودادِ قیس ہو کہ مری داستانِ عشق
دُنیا کے لب پہ کوئی تو افسانہ چاہیئے

لائیں گے اہلِ ہوش و خرد انقلاب کیا
اِس کام کے لئے کوئی دیوانہ چاہیئے

تنظیمِ مے کدہ پہ شکایت بجا سہی
رِندوں میں بھی تو جرأتِ رِندانہ چاہیئے

دِل میں خلوص اور محبّت ہو موج زن
عابدؔ لبوں پہ نعرۂ مستانہ چاہیئے

وہ جو زحمت اُٹھائیں آنے کی
جاگے قسمت غریب خانے کی

گلستاں سے دُھواں سا اُٹھا ہے
مانگیئے خیر آشیانے کی !

بڑھ گئی اور بے قراریِ دل
جب خبر آئی اُن کے آنے کی

بات کرتا ہے تو بھی اے ناصح
کِس زمانے میں کِس زمانے کی

عابد اشعار کہنے سے پہلے
نبض پہچانیے زمانے کی !

یہ حقیقت ہے میں ہوں ذرّۂ خاک
میرے تابع ہیں پھر بھی ہفت افلاک

تشنہ کامی سی تشنہ کامی ہے
زہر بھی ہے مرے لیے تریاک

اہلِ دل کی فقط یہی پہچان
چہرۂ زرد، دیدۂ نمناک

خود بھی حیراں ہیں حضرتِ یزداں
آدمی اور اِس قدر بے باک

کیوں میں شہرِ خرد میں اے عابدؔ
لیے پھرتا ہوں دامنِ صد چاک

آرزو دل میں رہی حسرت و حرماں کی طرح
زندگی ہم نے گزاری شبِ ہجراں کی طرح

میرے پہلو میں نہیں ہے وہ گلِ تر جب سے
گلستاں بھی نظر آتا ہے بیاباں کی طرح

زندگانی کا توازن نہ بگڑنے پائے
جام گردش میں رہیں گردشِ دوراں کی طرح

آرزوؤں کے وہ ہنگامے کہاں اُن کے بغیر
دل ہے سنسان کسی شہرِ خموشاں کی طرح

جان جاتے ہیں وہ عنوان سے افسانے کو
لوگ کم فہم نہیں ناصحِ ناداں کی طرح

کتنی پُر نور ہے میری شبِ ہجراں عابدؔ
دل میں ہے یادِ صنم شمعِ فروزاں کی طرح

اتنی سی آرزو لئے صحرا نورد ہوں
چھانی ہوئی یہ خاک پھر اک بار چھان لوں

اِس شہرِ بے حِساں میں اُٹھائے گا کون ننگ
کندھوں پہ سر کا بوجھ میں کب تک لئے پھروں

ہوگی نہ مطمئن کبھی دُنیائے خود پرست
سقراط کی طرح میں اگر زہر بھی پیوں

اپنی تباہیوں پہ مجھے ہنسنے دیجئے
میں چُپ رہا اگر تو یہ ڈر ہے نہ رو پڑوں

عابدؔ ہے خوشامد کی دیوار ہر طرف
لگتا ہے جیسے میں کسی زِنداں میں قید ہوں

اتنے چہروں میں نہیں کوئی شنا سا اپنا
اِس بھرے شہر میں اک شخص تو ہوتا اپنا

کھو گئے بھول بھلیوں میں ترے کوچے کی
ورنہ کچھ اور ہی تھا آج ارادا اپنا

ہم تھے بہروپیے دُنیا کا اُڑاتے تھے مذاق
لوگ دیکھا کیے خُوش ہو کے تماشا اپنا

وہ گیا دَور جب اِک جام سے پیتے تھے سبھی
اب تو ہر رِند کا پیمانہ ہے اپنا اپنا

اتنی دُشوار نہ تھی منزلِ مقصُود مگر
ہم نے دانستہ بدل ڈالا ہے رستا اپنا

لوگ کرتے رہے نظّارہ لبِ دریا سے
ڈگمگاتا رہا موجوں میں سفینا اپنا

دل کے آئینے میں جب غور سے دیکھا عابدؔ
اجنبی سا نظر آیا ہمیں چہرا اپنا

سرمایۂ جاں اُن پہ لُٹا کیوں نہیں دیتے
یہ قرضِ محبّت بھی چُکا کیوں نہیں دیتے

یُوں بادہ گُساروں کو تذبذب میں نہ ڈالو
مے خانے میں مے ہے تو پلا کیوں نہیں دیتے

خود بے خبرِ منزلِ مقصُود ہیں ورنہ
منزل کا پتہ راہ نمُا کیوں نہیں دیتے

جب جنسِ وفا کا کوئی گاہک نہیں ملتا
پھر تم بھی دُوکان اپنی بڑھا کیوں نہیں دیتے

کیوں سامنے اُن کے ہو لیں و پیش میں عابد
حالِ دلِ بے تاب سُنا کیوں نہیں دیتے

پڑھ ہی سکا کوئی نہ سمجھ ہی سکا مجھے
کس ساعتِ عجیب میں لکھا گیا مجھے

پھر دیکھ پھیلتا ہوں میں دُنیا میں کس طرح
میرے حِصار سے کبھی باہر تو لا مجھے

یُوں بھی ہُوا ہے بے خودیِ عشق میں کبھی
خُود اپنے آپ پر ترا دھوکہ ہُوا مجھے

تدبیر کر رہا ہوں میں کب سے بہ صد خلُوص
اعجاز کوئی اے مری قسمت دِکھا مجھے

مجھ کو اُمید تھی کوئی عُقدہ کرے گا وا
میری ہی داستاں وہ سُناتا رہا مجھے

اُن کے بغیر گلشنِ کشمیر بھی ہے دشت
عابدؔ جلا رہی ہے یہ ٹھنڈی ہوا مجھے

پھر وہی ہے سُونے گھر کی کالی دیواروں کا ساتھ
آنکھ کھلنے تک رہا کیا کیا حسیں خوابوں کا ساتھ

پیاسے کا پیاسا ہی رکھا میری غیرت نے مجھے
ورنہ مجھ کو تھا میسّر کتنے دریاؤں کا ساتھ

کون اک مظلوم پردیسی پہ کھائے گا ترس
لوگ دیں گے اپنے ہی گاؤں کے باشندوں کا ساتھ

گرتے پڑتے پا ہی لوں گا اپنی منزل ایک دن
چھوڑ دوں عابدؔ اگر میں قافلے والوں کا ساتھ

کتنے پانی میں ہوں آخر آزمانا ہے مجھے!
ایک دن خود کو بھی آئینہ دکھانا ہے مجھے!

دل غموں سے کر لے سمجھوتا میں اس کوشش میں ہوں
ایک بستا گھر اُجڑنے سے بچانا ہے مجھے

فرق بس یہ ہے مرے سر پر نہیں کانٹوں کا تاج
آج ورنہ خود صلیب اپنی اُٹھانا ہے مجھے!

ذکرِ فرہاد اس میں ہے تمہید کی خاطر فقط
در حقیقت اپنا افسانہ سُنانا ہے مجھے

کچھ تو اپنے زندہ دل ہونے کا رکھنا ہے بھرم
چاہے دِل روتا ہو پھر بھی مُسکرانا ہے مجھے

اِس طرح ترتیب دینا ہے مجھے ہر واقعہ
آپ بیتی کو بھی جگ بیتی بنانا ہے مجھے!

بادۂ عشرت نہیں عابد تو اشکِ غم سہی
تشنگی اپنی بہ ہر صورت بجھانا ہے مجھے

حُسنِ یقیں سے کام لے، وعدے پہ اعتبار کر
آئے نہ آئے وہ یہاں، تو مگر انتظار کر

مانا کہ شش جہت پہ ہے، میرا وجود منکشف
لطف تو جب ہے مجھ پہ بھی، تو مجھے آشکار کر

رسمِ جنون بھی ہے یہی، شانِ جنوں بھی ہے یہی
دامنِ تار تار کو، اور بھی تار تار کر!

تُو نے عبث عذاب میں آنکھوں کو مبتلا کیا
کس نے کہا تھا یہ تجھے، رنگوں پہ اعتبار کر

حالِ دلِ پُر اضطراب، پُوچھ کر اِس سے بار بار
عابدِ سوگوار کو، اور نہ سوگوار کر

باطن کی آنکھ سے جو کبھی دیکھتا ہوں میں
لگتا ہے جیسے خود سے بھی نا آشنا ہوں میں

اِس دَر سے خالی ہاتھ ہی پلٹا ہے ہر کوئی
دستِ سوال لے کے کہاں آ گیا ہوں میں

مجھ کو ہوا اُڑا کے جدھر چاہے لے چلے
پتّا ہوں اور شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں میں

مجھ سا بھی سادہ لوح زمانے میں ہے کوئی
اپنی تباہیوں پہ بھی خوش ہو رہا ہوں میں

ہے ٹھیک یا غلط مرا اندازِ گفتگو
عابدؔ جو کہنا تھا مجھے وہ کہہ گیا ہوں میں

اے دِل تو نے پیار کیا ہے کس نرموہی سے
رمتے جوگی بہتے دریا کِس کے میت ہوئے

خود اپنی ہی کستوری کی خوشبو سے بے کل
انجانے میں آہو لیکن ہر جانب بھٹکے

زہریلے سانپوں کا جنگل تاریکی ہر سو
منزل کی دُھن دل میں لیکن آگے کون بڑھے

غیب سے آوازیں دیتا ہے کوئی مجھے لیکن
کیوں کر نِکلوں اپنے گھر کی بھول بھلیوں سے

کیسے سوئیں برکھا رُت میں عابدؔ چین کی نیند
اِس موسم میں ہو جاتے ہیں دل کے زخم ہرے

میری وحشت کا یہ قصّہ تھا فقط
اک نظر آپ کو دیکھا تھا فقط

کتنی دُوری تھی دِلوں میں لیکن
فاصلہ ایک قدم کا تھا فقط

ساری دُنیا تھی نظر سے اُوجھل
سامنے تیرا سَراپا تھا فقط

ہر گھڑی میرے تعاقب میں جو تھا
میرے ہی وہم کا سایا تھا فقط

بہہ گئے کتنے ہی ارمان اِس میں
ایک اشک آنکھ سے ٹپکا تھا فقط

تم یہ کیا سوچ رہے ہو عابد
اُس نے تو نام ہی پوچھا تھا فقط

ہم نے مانا کہ باوفا بھی نہیں
بے وفا ہے وہ یہ بجا بھی نہیں

کس لئے راستے میں بیٹھے ہیں
کوئی ہم سے یہ پوچھتا بھی نہیں

کون اب رہ نمائے منزل ہو
دُور تک کوئی نقشِ پا بھی نہیں

کب سے ہم دے رہے ہیں آوازیں
کوئی کھڑکی سے جھانکتا بھی نہیں

کیوں ہیں عابدؔ ہم اِس قدر مایوس
زندگی اِتنی کج ادا بھی نہیں

یہ ہنستے ہیں چاہے دل اِن کا جلے
ترے دل جلے ہیں عجب منچلے

وہ سورج صفت بھی نہیں جانتا
کٹے دن ہمارے بُرے یا بھلے

کھنچے آتے ہیں جانب مے کدہ
یہ ہو جاتا ہے کیا ہمیں دن ڈھلے

کسی کا سہارا نہ جب مِل سکا
ہم اُنگلی ہوا کی پکڑ کر چلے

محبت میں عابدؔ نہ پاؤ گے کچھ
نہیں سایہ تک اِس شجر کے تلے

وہ نظر مہرباں سی لگتی ہے
ہر تمنا جواں سی لگتی ہے

یہ سرِ شام کس کا قتل ہوا
کیوں شفق خوں چکاں سی لگتی ہے

ہاں ذرا پھر حدیثِ قیس کہو
یہ مری داستاں سی لگتی ہے

زندگانی بھی آج تیری طرح
ہم سے کچھ بد گماں سی لگتی ہے

جب سے وہ میرے ساتھ ہیں عابدؔ
رہ گزر کہکشاں سی لگتی ہے

سُرخ، نیلی، سبز، پیلی اور دھانی تِتلیاں
ظاہراً خوش رنگ لیکن دل کی کالی تِتلیاں

یہ کسی کو بھی نہیں معلوم دھوکے میں ہے کون
کاغذی ہی پھول ہیں سب کاغذی ہی تِتلیاں

کم نہیں گُل کی ہوس پژمُردگی کے بعد بھی
دیکھتا رہتا ہے دن بھر اُڑتی پھرتی تِتلیاں

اُن کے رنگوں کو نہ دیکھ ان کی اداؤں پر نہ جا
یہ تو ہیں ہر پھول پر منڈلانے والی تِتلیاں

اب کے سرسوں کی جگہ اُگ آئی ہے تھوہر کی فصل
ورنہ اے عابدؔ! یہاں تھیں تِتلیاں ہی تِتلیاں

غمِ اُلفت، غمِ زمانہ مِلا
ہمیں اِس زندگی میں کیا نہ مِلا

مل گیا آستانِ پیرِ مُغاں
بے ٹھکانوں کو بھی ٹھکانہ مِلا

ہر گھڑی بجلیوں کا ڈر ہے یہاں
کِس گلستاں میں آشیانہ مِلا

دیر میں کعبہ میں کلیسا میں
لاکھ ڈھونڈا مگر خُدا نہ مِلا

کیوں نہ ہو دورِ خودِ سزا عابد
اِس کا ہر طورِ باغیانہ مِلا!

میں اپنے درد کا اظہار کر گیا آخر
چڑھا ہُوا تھا جو دریا اُتر گیا آخر

اکیلا چھوڑ کے مجھ کو چلا گیا ہے کہیں
اندھیری رات سے سُورج بھی ڈر گیا آخر

ہوا کے رُخ پہ سنبھل کر چلے بہت پھر بھی
ہمارے سر سے سمُندر گزر گیا آخر

خُود اپنے سر پہ ہی ہاتھ اپنا رکھ دیا اُس نے
سبھی کو مارنے والا بھی مر گیا آخر

کئی برس جو رہا ہے مرے تعاقُب میں
اچانک آج وہ عابد کدھر گیا آخر

صورتِ طلب بے تمنا ہوں
آج کل کس قدر میں تنہا ہوں

ایسے کرتا ہوں اُن کی دِل جوئی
آپ اپنی ہنسی اُڑاتا ہوں

پُوچھتے ہو مرا ٹھکانہ کیا
رمتا جوگی ہوں بہتا دریا ہوں

جس کے دل میں ہو پیار اور خلوص
اُس بشر کو خدا سمجھتا ہوں

اپنی بربادیوں پہ اے عابدؔ!
آپ ہی قہقہے لگاتا ہوں

خانۂ دل میں ترے غم کو بسایا جائے
کچھ تو تنہائی کا احساس مٹایا جائے

دل خوددار اجازت نہیں دیتا ہم کو
کہ اُنھیں حالِ دلِ زار سُنایا جائے

روشنی کم نہ کسی طور ہو اے دیوانو!
دل جلایا ہے تو اب گھر بھی جلایا جائے

مے کدے کے بھی آداب ہیں اے بادہ کشو
مُحتسِب کو بھی سر آنکھوں پہ بٹھایا جائے!

جو یہ کہتے ہیں نہیں صنفِ غزل میں وُسعت
اُن کو عابدؔ کا کلام آج سُنایا جائے

اپنے کندھوں پہ رکھ کر اپنی صلیب
آزمانے چلا ہوں آج نصیب

حق پرستوں کو سنگسار کرو
یہی شہرِ خرد کی ہے تہذیب

نہ بتا میری خامیاں مجھ کو
میرے اندر چھپا ہے میرا رقیب

چاند پر تم پہنچ گئے ہو مگر!
دلِ انساں تو ہے بہت ہی قریب

وہ نہ سمجھیں گے اِس کو اے عابدؔ
تیرا افسانہ ہے عجیب و غریب

یوں بھی شبِ فرقت کبھی محسوس ہوا ہے
جیسے کوئی پہلو سے ابھی اُٹھ کے گیا ہے

ہم نے تو کئی بار تجھے لکھے ہیں خط بھی
ہم نے تو کئی بار تجھے یاد کیا ہے

برسوں ہوئے کشتی کوئی واپس نہیں آئی
اک شخص مگر آج بھی ساحل پہ کھڑا ہے

اب کوئی خریدار نہیں جنسِ وفا کا
ہر تاجرِ اخلاص خسارے میں رہا ہے

باتوں سے بھی بنتے ہیں کئی کام جہاں میں
یہ درس ہمیں حضرتِ ناصح سے ملا ہے

آ اے غمِ دوراں! تجھے سینے سے لگالیں
صد شکر کسی نے تو ہمیں یاد کیا ہے

محسوس ہوا بعدِ ملاقات یہ عابدؔ
درشن کے وہ چھوٹے ہیں مگر نام بڑا ہے

اُس کی جفاؤں میں بھی مُروّت دکھائی دے
نفرت بھی وہ کرے تو محبّت دکھائی دے

دیکھے جو تُو کبھی مری آنکھوں میں جھانک کر
اِن میں تجھے فقط تری صُورت دکھائی دے

گھر سے نکل کے شہر میں تُو جستجُو تو کر!
ممکن ہے کوئی صاحبِ غیرت دکھائی دے

عابدؔ ہمارے واسطے ہوگا وہ روزِ عید!
جس روز بھی وہ چاند سی صورت دکھائی دے

تسخیرِ آسماں کے لئے دُور تک گیا
پلٹا میں جب وہاں سے خلا میں لٹک گیا

پھر یُوں ہُوا کہ دُھند میں ہر راہ کھو گئی
اندھا سفر تھا قافلہ رستہ بھٹک گیا

سرسبز ہو سکا نہ مرا باغِ آرزُو!
پھر بھی کسی کی یاد کا غُنچہ چٹک گیا

کچھ اور بڑھ گئی ہے سمُندر کی تشنگی
پیمانہ آسمان کا جب بھی چھلک گیا

جب میرا اور اُس کا تعلق ہی کچھ نہیں
عابد وہ سُن کے نام مِرا کیوں ٹھِٹک گیا

دل کی نگری میں وہ پل بھر ہنسنے ہنسانے آیا تھا
جیسے گوکل میں اک چھلیا راس رچانے آیا تھا

بھنورا کتنا نرموہی تھا سوچ رہا ہے پھول یہ اب
رُوپ کا لوبھی رس کا رسیا پیاس بجھانے آیا تھا

سُورج چاند ستارے سب ہی بن گئے اُس کے دشمنِ جاں
اک ننھا سا جگنو مجھ کو راہ دکھانے آیا تھا

کیا جانے وہ سوچ کے کیا کچھ چلا گیا بِن برسے ہی
بادل بن کر جو صحرا میں پھول کھلانے آیا تھا

میرے من کے دوار پہ کس نے دستک دی تھی اے عابدؔ
سوئی ہوئی البیلا شاؤں کو کون جگانے آیا تھا

انجامِ وفا سے آشنا ہوں
اور اُن سے وفا بھی کر رہا ہوں

چہرے چہرے کو پڑھ چکا ہوں
پھر بھی انجان ہی رہا ہوں

سُننے والے تو تھے گراں گوش
بے مصرف بولتا رہا ہوں

تیری رحمت کے آسرے پر!
مائل بہ گُناہ ہو گیا ہوں

سب لُطفِ بہار اُٹھا رہے ہیں
اِک میں ہوں کہ خار چُن رہا ہوں

رودادِ شبِ فراق عابدؔ
تیرے چہرے سے پڑھ رہا ہوں

غمہائے زندگی سے تعارُف کرا دیا
تُو نے مرا مجھی سے تعارُف کرا دیا

ہم نے بڑے خلُوص سے گھر اپنا پھُونک کر
ظُلمت کا روشنی سے تعارُف کرا دیا

ناصح کی گفتگو سے پریشان ہوں بہت
میرا کس آدمی سے تعارُف کرا دیا

گو ہم رہینِ گردشِ دوراں رہے مگر
اِنساں کا زندگی سے تعارُف کرا دیا

عابد کچھ اور اہلِ سیاست نہ کر سکے
گلچیں کا ہر کلی سے تعارُف کرا دیا

رُخ کے روشن ہیں دل کے کالے ہیں
یہ حسیں میرے دیکھے بھالے ہیں

آپ ہی نے نظر چرائی ہے
آپ ہی دِل چُرانے والے ہیں

بے وفا دوستوں پہ مرتا ہوں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

مے کشو! وجہِ انتشار ہے کیا؟
تم نے کیوں جام توڑ ڈالے ہیں

گیسوؤں سے ہے تابناکیِ رُخ
اِن اندھیروں میں کیا اُجالے ہیں

آپ ناراض تو نہیں ہوں گے
ہم بھی اک بات کہنے والے ہیں

آج عابدؔ تری خموشی نے
دل کے سب راز کھول ڈالے ہیں

یہ حقیقت ہے غم و آلام کے ماروں میں ہیں
پھر بھی ہم اے زندگی تیرے طرفداروں میں ہیں

یوں تو کتنے چلتے پھرتے لوگ بازاروں میں ہیں
دل مگر سب کے مُقیّد گھر کی دیواروں میں ہیں

گاؤں، قصبے، شہر ہی تو ہیں نشانِ اِرتقا
ورنہ ذہنی طور پر ہم آج بھی غاروں میں ہیں

ہر بدن جھُلسا دیا ہے چلچلاتی دُھوپ نے
پھر بھی ہم دیوانے سُورج کے پرستاروں میں ہیں

دیکھتے ہیں سب مگر عابدؔ کوئی پڑھتا نہیں
اِشتہاروں کی طرح ہم لوگ اخباروں میں ہیں

رُو بہ رُو جب سے ہے وہ جانِ غزل
دِل میں ہے کچھ عجیب سی ہل چل

اَبر آلُود سی تھی شام کوئی !
اُن سے جب ہم ملے تھے پہلے پہل

یُوں مرے دِل میں ہے کسی کی یاد
جھیل میں تیرتا ہو جیسے کنول

گر نہ جائے حیات کا معیار
کیجئے کچھ تو اِس میں ردّ و بدل

بے کسی ، رنج ، درد ، مایُوسی
عشق ہے آنسوؤں کا تاج محل

اُف! شبِ ہجر اِنتظار ترا
کم نہیں سو برس سے اِک اِک پل

دیکھ دُنیا کا طور اے عابد
تُو بھی اب وقت کے مُطابق چل

کر گیا ظلمتِ ہجراں میں اُجالا چہرہ
مطلعِ نور ہے اُس جانِ غزل کا چہرہ

خاکۂ قلب میں ہو رنگِ تمنّا جیسے
یوں مِری آنکھوں میں رہتا ہے کسی کا چہرہ

میرے دِل میں بھی ذرا جھانک مِرے زخم بھی دیکھ
تو فقط دیکھ رہا ہے مرا ہنستا چہرہ

بیٹھا رہتا ہوں میں رستے میں یہ اُمیّد لئے
کوئی شاید نظر آجائے شناسا چہرہ

پا رہا ہوں میں کئی روز سے تنہا خود کو
پڑھ رہا ہوں میں کئی روز سے چہرا چہرہ

بن گیا خار مرے کوٹ کے کالر کا گُلاب
کر گیا تازہ اِک اِک زخم کسی کا چہرہ

لاکھ حالِ دلِ بے تاب چھپایا اے عابدؔ
کہہ ہی دے گا شبِ ہجراں کا فسانا چہرہ